پیام اقبال Bahria Research Journal on Iqbal Studies (BRJIS)
1(1), 1-23, 2022

کلام اقبال میں تصورِ حرکت و عمل

The concept of movement and action in Iqbal’s poetry

Ajaz Anjum
Hazara University, Mansehra
ajazanjum060@gmail.com

Abstract

The study of nature shows that everything is trying to survive. All livings have a passion for making life eternal at every moment. Science has proven that the hidden phenomenon of this universe is "motion", whether the cell is taken as an experiment or the atom. The motion and vibration of the components of the universe is, in fact, an attempt at survival. Like a flower, it withers and merges into the dust, but from its seeds, it provides its own kind of survival, from which a flower is born again. This basic discussion reaches the philosophy of life after death and reveals the secret of the survival of human life. The central theme of Allama Iqbal's poetry is "movement and action". In order to put this exemplary concept into practice, Iqbal proposed several other concepts which result in "movement" and "action". Iqbal's philosophy of life is of great importance in this regard. Since movement is related to life and the existence of life depends on this effort and pursuit. Therefore, Iqbal's philosophy of life seems to be the most meaningful in terms of movement and action. The concept of “*Khudi*”, “*Mard e Momin*” and “*Shaheen*” is the preaching of action.

Keywords: Nature, eternity, survival, Iqbal, movement and action, *Jawab-e-Shikwa*, *Taloo-e-Islam*

کلیدی الفاظ: مطالعۂ فطرت، بقائے دوام، تحرک و ارتعاش، فلسفۂ حیات بعد الممات، حرکت و عمل، جوابِ شکوہ، طلوعِ اسلام، اقبال

حرکت، وجود کی داخلی حقیقت ہے۔ اگر مظہرِ حرکت کو معدوم کر دیا جائے تو نظامِ کائنات پل بھر میں درہم برہم ہو جائے۔ زمین کی اپنے مدار میں گردش اور پھر نظامِ شمسی میں سورج کے گرد چکر، ستاروں اور سیاروں کا اپنے اپنے مدار میں محوِ حرکت رہنا عقلِ انسانی کو اس جانب راغب کرتا ہے کہ حیات حرکت کا دوسرا نام ہے۔ احبابِ فکر و دانش نے اس پر کافی دماغ سوزی دکھائی ہے اور انسان پر واضح کر دیا ہے کہ زندگی تب زندگی ہے جب "عمل" اور "حرکت" اپنا وجود رکھے۔ بصورتِ دیگر حیاتِ انسانی ایک لاحاصل شے ہے اور اس کے ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے۔ ڈارون کے مطابق انسان کو بندر کی ہی ارتقائی صورت مان لیا جائے اور ایک لمحے کے لیے مشاہدہ کیا جائے تو انسان کی تمام تر تہذیبی ترقی اس کی تخلیقی سوچ اور اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے کی جانے والی محنت (حرکت و عمل) ہی ہے۔ ہر قوم کے مفکرین نے اپنی اپنی قوم میں نئی روح پھونکنے کے لیے اپنی بساط کے مطابق ایسی رہنمائی کی ہے کہ مردہ تن میں جان پڑ جائے۔ افریقہ میں نیلسن منڈیلا اور ایشیاء میں سر سید احمد خان اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ سرزمین ہند پر اللہ تعالیٰ نے متعدد ایسی شخصیات پیدا کیں جنھوں نے قوم کو متحرک کیا اور اس کے فکری جمود میں تلاطم بپا کر دیا۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ اس حوالے سے سرِ فہرست ہیں کہ انھوں نے قوم کی رہنمائی اپنے اشعار و ملفوظات میں متعدد مقامات پر کی ہے۔ کلامِ اقبالؒ میں حرکت و عمل ہر تصور کے پس منظر میں موجود ہے۔ اسی زاویے سے اقبالؒ کے کلام کا مطالعہ پیشِ نظر مقالے میں کیا گیا ہے۔

سابقہ تحقیقات اور درپیش مسئلہ

علامہ اقبالؒ کی شخصیت اور فکر و فن پر متعدد مقالات و مضامین سامنے آ چکے ہیں۔ ان تحاریر میں اقبال کے افکار کا عادلانہ و منصافانہ تجزیہ موجود ہے اور کافی حد تک توضیحات پر مبنی تحقیقات سامنے آئی ہیں۔ اقبالی فلسفے کی ابتداء و انتہا حرکت ہے۔ لہٰذا تصوراتِ اقبال پر جو بھی بحث ہوئی ہے اس میں لامحالہ حرکت و عمل کا مضمون پس پردہ یا بظاہر آیا ہے۔ الگ سے کلامِ اقبال میں حرکت و عمل کے تصور پر کوئی مبسوط مقالہ یا تصنیف راقم کی نگاہ سے نہیں گزری۔ موجودہ قومی

انحطاط اور فکری جمود کے درپیش مسئلے کے حل کے لیے لازم ہے کہ کلامِ اقبالؒ کے اس پہلو پر بطورِ خاص روشنی ڈالی جائے۔

مقصدِ تحقیق

پیش نظر تحقیق کا مقصد مسلم امہّ کے فکری جمود میں خلل ڈال کے حرکت برائے عمل پیدا کرنا ہے۔ جذباتِ مفیدہ سے عاری قلوب اور بے زور بازوں میں نئ روح پھونکنا اور اقبالؒ کے اس تصور کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ اغیار اس وقت حرکت و عمل میں ہیں اور یورپ علمی میدان میں دنیا کا امام بن چکا ہے۔ مسلمان اس انتظار میں ہے کہ یورپ کون سی نئ مشین ایجاد کرے اور میں اس کو خرید کو آسائشاتِ مادی حاصل کر لوں۔ اُس طرف عمل ہے اور یہاں سستی اور کاہلی کا ثبوت۔ اسی جمود کو توڑنے کی غرض سے اقبال نے شاہین اور مردِ مومن جیسے تصورات پیش کیے۔ عشق، شاہین اور مردِ مومن کا تصور فقط اپنی وضاحت ہی کا متقاضی نہیں بلکہ ان تصورات کی توجیہہ انتہائی ضروری ہے۔ انہی تصورات کی توجیہات کو مقصد بنا کر یہ مقالہ ترتیب دیا جارہا ہے۔

سوالاتِ تحقیق

- پیشِ نظر تحقیق ان سوالات کے جوابات کی تلاش میں تکمیل پائی ہے:
- اقبالی فلسفے کی اصل روح کیا ہے؟
- تصوراتِ اقبال کا ماحاصل کیا ہے؟
- عہدِ جدید میں تصوراتِ اقبال کی تفہیم و تقلید کیوں ضروری ہے؟
- تصورات اقبال کے پس پردہ اور ماحاصل تصورِ حرکت و عمل تک رسائی اور اس کا اطلاق ذات پر اور پھر معاشرے میں کس حد تک لازم ہے؟

طریقِ تحقیق

تحقیق کا طریقِ کار دستاویزی اور تاریخی ہے۔ تنقیدی و توضیحی انداز سے موضوع کو تکمیلی شکل دی گئی ہے۔ زیادہ توجہ کلامِ اقبال اور ان عبارتوں پر مرکوز رہی ہے جن میں اقبالؒ نے قرآنِ مجید اور مظاہرِ فطرت کے مشاہدے سے اپنے تفکرات پیش کیے ہیں۔ شاملِ تحقیق اشعار کا توضیحی جائزہ لیا گیا ہے اور شعر میں موجود حرکت و عمل کے درس کو منظر نامے پہ لایا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے شروحاتِ کلامِ اقبال اور دیگر اقبالی فلسفے پر مشتمل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ماخذات میں کلامِ اقبالؒ اور تصوراتِ اقبال کے توضیحی و تنقیدی مطالعات پر مبنی کتب شامل ہیں۔

تحدید

اقبالؒ شاعرِ فطرت اور شاعرِ انسان ہے۔ اقبالؒ کو فقط شاعرِ مسلمان کہنا اقبالی فلسفے کی آفاقیت کے ساتھ سراسر ناانصافی ہو گی۔ پیشِ نظر موضوع بھی آفاقی ہے اور بلا تفریق مسلم و غیر مسلم ہر شخص کے لیے لائقِ تقلید ہے۔ بالخصوص یہ تحقیق امتِ مسلمہ کے منجمد معاشرے کے لیے ہے جو ذوقِ عمل سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور حرکت و عمل کے ثمرات سے بالکل بے بہرہ ہو چکا ہے۔ شعبۂ اقبالیات میں قدم رکھنے والے نئے محققین کے لیے یہ مقالہ مفید ثابت ہو سکتا ہے کہ تصورات کی تفہیم و شرح میں اس نکتے کو بھی مدِ نظر رکھا جائے گا۔

"حرکت و عمل" اور تصوراتِ اقبال کا توضیحی جائزہ

ہر مفکر کی تحاریر و تقاریر اور فلسفیانہ افکار و نظریات کا ایک محور و مرکز ہوتا ہے جو سارے فلسفے کی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حکیم و دانا کا فلسفیانہ سفر اسی مقام پر جا کر منتج ہوتا ہے۔ نتیجہ ایک خاص فکر ہے جو اس شخصیت کی وجہِ تعارف بنتا ہے اور آنے والی نسلیں اسی حوالے سے اپنے مفکر کو یاد رکھتی ہیں۔ جیسا کہ سقراط کا مباحثۂ عام، افلاطون کا نظریۂ اعیان، ابنِ خلدون کا نظریۂ تاریخ، ارسطو کا نظریۂ المیہ اور شیخ محی الدین ابن العربی کا نظریۂ وحدت الوجود وغیرہ۔ اگر

اس پس منظر میں حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کے شاعرانہ افکار کا بنظرِ عمیق جائزہ لیا جائے تو بیشتر تصورات سے ہوتے ہوئے قاری جس نتیجے پر پہنچتا ہے وہ فلسفۂ حرکت و عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی فطرت کو اسی قانون پہ استوار کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے صرف یہی ایک تصور عالمِ مشہود میں دیکھنے کی غرض سے کئی دوسرے تصورات پیش کیے۔ ہر تصور کا فرداً فرداً جائزہ لیا جائے تو یہی عنصر ہر تصور میں نمایاں ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عابد حسین:

"اقبالؒ کی شاعری تو آبِ حیات کا خزانہ ہے جس سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے ابلتے ہیں، جس سے سیراب ہو کر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور امید کی کھیتی لہلہانے لگتی ہے"۔[1]

سب سے پہلے علامہ اقبالؒ کا تصورِ حیات بطورِ مثال لے لیا جائے تو انسانیت اور کائنات کی ہر نوع کی بقا حرکت و عمل میں قرار دیتے ہیں۔ خود زندگی اس پر دلیل ہے کہ اسے ثبات حاصل نہیں۔ زندگی اپنے زاویے اور حالتیں بدلتی رہتی ہے۔ زندگی اور وجودِ فطرت کا اپنی حالتیں بدلنا بقائے دوام کی کوشش ہے جو کہ ہر شے کی فطری خواہش ہے۔ اسی سے جہد للبقا کا تصور پھوٹتا ہے۔ اقبال کے ہاں زندگی ایک مسلسل جدوجہد اور جستجو کا نام ہے جس میں ہر آن تغیر ہے۔ سکون و ثبات سے بے نیاز زندگی کا پہیا ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ ساقی نامہ میں وجودِ کائنات کی اس بے قراری کو نہایت فصاحت کے ساتھ یوں بیان کیا:

فریبِ نظر ہے سکُون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تُو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی(۲)

اگر وجودِ ہستی میں یہ تحرک اور اضطراری کیفیت موجود نہ ہو تو زندگی اپنے ہونے کا ثبوت نہیں دے سکتی۔ تغیر و تبدل اور انقلاب، نمودِ حیات کے بہانے ہیں۔ روحِ اقبال میں آتا ہے:

"بقائے نوع کی کوشش فطرت میں ہمیں صاف نظر آتی ہے۔ گلاب کا پھول مہکتا، دمکتا، کھلتا، آس پاس کی فضا کو معطر کرتا اور پھر مرجھا کر جس خاک سے اگا تھا اسی میں مل جاتا ہے۔ وہ خود تو فنا ہو جاتا ہے مگر اپنے بیجوں سے اپنی نوع کی بقا کا سامان مادی حیثیت سے مہیا کر جاتا ہے۔ وہی خاک جس میں وہ مل گیا، اس کے بیجوں کی پرورش کر کے آئندہ موسمِ بہار تک انہیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ اپنی نرم و نازک ٹہنیوں سے گلاب کے پھول پیدا کر سکیں"۔ (۳)

اس بیانیے سے یہی نتیجہ برآمد ہوا کہ ہر شے اپنی نوع کی بقا چاہتی ہے۔ یہی بنیادی بحث فلسفۂ حیات بعد الموت تک رسائی حاصل کر جاتی ہے اور انسانی زندگی کی بقائے دوام کا راز فاش کر دیتی ہے۔ اس پورے عمل میں جو مرکزی نقطہ ہے وہ حرکت ہے۔ پھول کے کھلنے سے مرجھانے اور دوبارہ سے کھلنے تک کے تمام مراحل دراصل ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ اقبالؒ نے اسی فطری اصول کو مدِ نظر رکھ کر کہا تھا:

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پُوچھ
جُوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ اِمروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی(۴)

زندگی کا ہر دم جو اں ہونا اس کے داخلی تحرک پہ ہی منحصر ہے۔ جس مقام پر سکون آگیا تو یہی لمحۂ موت ہے۔ ثابت ہوا کہ علامہ اقبال کے ہاں حیات "حرکت" کا دوسرا نام ہے۔ جس قدر تڑپ، کوشش جستجو اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ دل میں موجود ہو گا، تو وہ انسان زندہ ہے۔ اگر جستجو کا مادہ ختم ہو جائے تو انسان حالتِ سکون میں آجاتا ہے اور یہ اس کے لیے مقامِ موت ہے۔ اس لیے اقبالؒ ہر وقت مشتِ خاک کو مضطرب اور آمادہ بر عمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ بقولِ اقبال:

ظلامِ بحر میں کھو کر سنبھل جا
تڑپ جا، پیچ کھا کھا کر بدل جا
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج!
اُبھر کر جس طرف چاہے نِکل جا![۵]

"موج" اقبال کی شاعری میں ایک خوبصورت استعارہ ہے جو اپنے معنی کے اعتبار سے قلبِ اقبالؒ سے مماثل ہے۔ موج میں ہر لحہ تغیّر، تحرک اور منزل پانے کی جستجو موجود رہتی ہے۔ اس لفظ 'موج' سے علامہ اقبال نے اکثر نوجوان کو مخاطب کیا ہے اور رازِ حیات سمجھنے کی ترغیب دی ہے۔

اقبال کا سب سے بڑا تصور جو وجہِ شہرت بنا "خودی" ہے۔ جو سراسر حرکت و عمل کا درس ہے۔ تصورِ خودی کی بنیاد عشق ہے اور اسی سے دیگر تصورات، مردِ مومن، شاہین، قضاو قدر یا تقدیر وغیرہ جڑے ہوئے ہیں۔ لفظ "عشق" اقبال کے ہاں انفرادی معنوں میں آیا ہے۔ عشق کو حرکت کی سان چڑھا کر اقبال نے ایسی تلوار بنا دیا ہے جو رزمگاہِ حیات کے ہر معرکے میں بہترین ہتھیار ہے۔ خود اس نئے معنی کے بارے میں کہتے ہیں:

"یہ لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا، اس کے معنی ہیں جذب کر لینے اور اپنے آپ میں سمو لینے کی خواہش۔ اس کی سب سے اعلیٰ صورت قدروں اور نصب العینوں کی تخلیق اور ان کو ایک واقعیت بنا لینے کی کوشش ہے"۔[۶]

نصب العینوں کی تخلیق سے لے کر ان کو ایک واقعیت بنا لینے کی کوشش تک ہر لحظہ حرکت اور عمل کا تصور پھوٹ رہا ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی نصب العین خود چل کر طالب تک نہیں آتا۔ اگر طالب کامیاب ہونا چاہتا ہے تو اسے اپنی کوشش و جستجو سے مطلوب تک پہنچنا ہو گا۔ یہ کائنات چونکہ دارالعمل ہے اور ابھی ناتمام ہے۔ اس لیے ہر لحظہ اس میں تبدیلی آنے کے امکانات ہیں۔ یہ انسان ہے جو اس دنیا میں تبدیلی کا موجب بنتا ہے اور جغرافیوں کی شکل تبدیل کر دیتا ہے۔ نقشوں کے نقشے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہوا کہ انسان بھی کسی حد تک وجود کے بنانے اور بگاڑنے میں قدرت رکھتا ہے۔

جذب کر لینے کی خواہش یا عشق استحکامِ خودی کی دلیل ہے۔ اسرارِ خودی میں علامہ اقبال نے استحکامِ خودی سے متعلق ایک باب قائم کیا ہے۔ "در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام می پذیرد"۔ (اس بیان میں کہ خودی عشق و محبت سے استحکام حاصل کرتی ہے)۔ جب انسان خودی کے مقام تک پہنچ جائے تو اس کا وجود لافانی ہو جاتا ہے اور حیاتِ دوام حاصل کر لیتا ہے۔ اب یہ عقدہ بھی وا ہوا کہ انسان حرکت سے عشق، عشق سے خودی اور استحکامِ خودی سے حیاتِ دوام حاصل کر سکتا ہے۔ اگر اس کائنات کو پہلے سے مکمل اور بھرپور سمجھا جائے جیسا کہ بعض وجودیوں نے خیال کیا یا افلاطون کا نظریۂ اعیان پر ایمان لا کر اس کائنات کو اصل وجود کی شبیہ مان لیا جائے تو، کوشش و جستجو کا مادہ از خود مفقود ہو جائے گا۔ جس کے مضر نتائج تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں اور فطرت اس کی عینی شاہد ہے۔ شمیم حنفی علامہ اقبال کے اس تصور پر ایک دلیل دیتے ہیں:

> "انسان زمانے کی حرکت کا خط ابھی کھینچ رہا ہے۔ جس سے مراد اس کی مخفی امکانات اور قوتیں ہیں۔ اس طرح موجود "وجود پذیر" بھی ہے اور کیر کے گارڈ (Kierkegaard) کی اصطلاح میں، امکان سے واقفیت کی طرف رواں، یہ امکانات ہی اسے لزوم یعنی پابندیوں سے آزاد کرتے ہیں۔ وہ جوہر (کی جبریت) کے خول سے باہر نکلتا ہے اور اپنے وجود کی بے کرانی کا اظہار

کرتا ہے۔ یہ امکان کی خاموش قوت انسان کو برابر ممکنات کی طرف بلاتی رہتی ہے۔ اس قوت کا مخرج انسان کا وجود ہے، اس کا اظہار جوہر کا تعین۔ یہ قوت اتنی لا محدود ہے کہ ستاروں سے آگے بھی کئی نادیدہ جہانوں کی سیر کا تقاضا انسان سے کرتی رہے گی"۔[۷]

اگر ڈارون(Darwin) کا نظریہ ایک لمحے کے لیے صحیح مان لیا جائے کہ انسان بندر کی ارتقائی صورت ہے تو آج انسان کا یوں متمدن ہونا اور سمندروں کی تہہ سے آغاز لے کر خلاوں کی حدوں تک رسائی حاصل کرنا، انسان کے فکر و عمل کا نتیجہ ہے۔ اگر اس عنصر کو اپنی ذات میں دبالیا اور عالمِ رنگ و بو کی ایک ہی حالت پر قناعت کرلی جائے تو زندگی اپنے جوہر سے بے بہرہ ہو جائے گی۔ شمیم حنفی نے ایک مقام پر بڑے کام کی بحث کی ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری میں جابجا اس بات پر زور دیا ہے کہ مٹی کے ایک انبار کی صورت، جب تک انسان ارادہ و عمل کی قوت سے محروم رہتا ہے اس کی ہستی خام ہوتی ہے اور شوق کی حرارت میں تپنے اور پختہ ہونے کے بعد ہی وہ شمشیرِ جگر دار بنتا ہے۔ زندگی ذوقِ پرواز کا نام ہے اور پرواز اس وقت ممکن ہے جب انسان اپنی حالت سے غیر مطمئن ہو اور اس کی نگاہ نئے جہانوں کی متلاشی ہو۔[۸] نئے جہانوں کی تلاش ہی انسان کو خوب سے خوب تر کی لذت عطا کرتی ہے، اور یہ زندگی کو سنوارتا جاتا ہے۔

اقبال نے افلاطون کے نظریۂ اعیان کی مخالفت صرف اسی وجہ سے کی ہے کہ وہ کائنات کے مادی وجود کے اثبات کا قائل نہیں۔ جب وجود کا ہی انکار ہو گیا تو فکر و عمل کا درس بے معنی ہے۔ افلاطون کے مطابق موجودہ کائنات اپنے مادی وجود کے اعتبار سے حقیقی نہیں بلکہ اس حقیقی کائنات جو ماورائے کائنات میں حقیقتِ مطلقہ کی صورت میں موجود ہے، کا عکس ہے۔ اسی طرح دیگر موجودات بھی ماورائے کائنات میں موجود اصل مظاہرات کا عکس یا پرتو ہیں۔ بنیادی طور پر انسانی روح ایک ایسی خارجی قوت ہے جو عرش سے پھوٹ رہی ہوتی ہے۔ جو اپنی فطرت میں لافانی ہے اور اس کا تعلق اس حقیقی کائنات سے ہے جو ہمارے حواس سے بالاتر کہیں اور موجود ہے۔ جس تک

صرف عقل کے ذریعے ہیں رسائی ممکن ہے۔[۹] حکیم افلاطون نے کائنات کے وجود کو جو کہ اپنی ایک حقیقت رکھتا ہے، غیر اصل اور غیر حقیقی قرار دے کر انسان کو بے عمل ہونے کی طرف راغب کیا۔ جب مظاہرِ کائنات اس حقیقی کائنات کا عکس ٹھہرے تو ان میں انسان کوئی ارادی تبدیلی لانے کے قابل ہی نہیں رہا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عملِ ارادی اور قوتِ گویائی کی صفت عطا کر رکھی ہے۔ بس یہی سبب ہوا کہ اقبال نے افلاطون کے اس نظریے پر تنقید کی۔

اسرارِ خودی کے دیباچہ میں اقبال نے زندگی کو آزادی کے لیے جدوجہد کا نام دیا ہے۔[۱۰] آزادی کے لیے جدوجہد کیا ہے؟ چونکہ انسان کی منزلِ مقصود لقائے ربی یا وصالِ ذات ہے۔ اس راہ میں پیش آنے والی تمام رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونا اور اپنے سفر (استحکامِ خودی) کو جاری رکھنا ہی حقیقت میں زندگی ہے۔ انسان کی یہ زندگی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ چونکہ روح پر موت نہیں، یہ صرف اپنا جہان تبدیل کرتی ہے تو اس سے اقبال کے اس شعر کی بھی تائید ہوتی ہے:

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو، جاوداں تُو ہے[۱۱]

اقبال کا تصورِ شاہین 'حرکت و عمل' کا نمونہ ہے۔ لہو گرم رکھنے کے لیے اس کا جھپٹنا اور پلٹنا، اس کی زندگی کی علامت بن جاتا ہے۔ اسی طرح مردِ مومن میں حرکت و عمل کے نمونے "رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن"[۱۲] میں عیاں ہیں۔ مردِ مومن کے متعلق علامہ اقبال نے کہا:

قُدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دُنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان[۱۳]

اس شعر میں مقاصدِ فطرت اور ارادۂ مردِ مومن کا جو تطابق ہے وہ فکر و عمل میں ہی ظاہر ہوتا ہے۔ مقصد اقبال کے ہاں بنیادی شے ہے۔ اس مقصد کا حصول ارادہ ہے اور حصولِ مقصد میں کی جانے والی کوشش و جستجو 'عشق' ہے جو حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے۔

بعض نے عشق کا مطلب یہ لیا کہ ذاتِ حق سے اس حد تک محبت کہ انسان اسی ذات میں غرق ہو جائے۔ یہاں فقط فلسفۂ وحدت الوجود کی بات کی جائے تو اقبال نے اس تصورِ تصوف پر شدید تنقید کی ہے۔ اس تنقید کی زد میں شیخ محی الدین ابن العربی، عراقی اور خواجہ حافظ شیرازی بالخصوص آئے۔ (ملاحظہ ہو اسرارِ خودی اور تصوف، مشمولہ مقالاتِ اقبال، ص ۲۰۰-۲۱۰) اقبال کے خیال میں مسلمانوں کے اندر زوال کے آثار اسی تصور کے پیشِ نظر پیدا ہوئے۔ جب وحدت الوجود والے اپنی منزلِ آخر فنا فی اللہ سمجھتے ہیں تو ان کے طرزِ عمل میں سستی اور کاہلی کا عنصر آ جاتا ہے۔ پھر حاصل یہ قناعت اور ظلم کے آگے صبر و رضا جیسے عوامل انسان کے قوائے عمل کو ضعیف کر دیتے ہیں۔ گزشتہ تین صدیوں میں مسلمان قوم کے اندر جو روحانی تعیش اور کاہلی آئی، اقبال کے نزدیک وہ وحدت الوجود کے عقیدے کا اثر ہے جو مسلمانوں میں غیر اسلامی اثرات سے پیدا ہوا۔ جس نے انفرادی نفس کے وجود کو باطل قرار دے کر ان کے دلوں سے فرد کی اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو مٹا دیا اور اس طرح مذہب و اخلاق کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا۔[۱۴] اس وجودی فلسفے پر تنقید کی زد میں ہندو حکما بھی آئے اور عیسائی رہبانیت بھی۔ رہبانیت کا رد تو بالکل قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ یہ ایک خود ساختہ تصوف ہے۔ بہر حال اقبال کے اپنے الفاظ میں وحدت الوجود کے نظریے کے اثرات یہ ہیں:

> "ہندو حکماء نے مسئلۂ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب بنایا مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریقہ اختیار کیا۔ یعنی انھوں نے دل کو اپنی آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا انجام

کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا"۔ (۱۵)

معلوم ہوا کہ تصوف وحدت الوجود میں اعتقادی ضعف کے ساتھ ساتھ جس نکتے کو سامنے رکھ کر اقبال نے مخالفت کی وہ ذوقِ عمل سے محرومی ہے۔

اقبالی فلسفے میں ہر اس بات پر تنقید ملتی ہے جس میں حرکت و عمل کا فقدان ہو اور علامہ اقبال نے ہر اس شخصیت اور تحریک کی دل کھول کر حمایت کی ہے جس میں حرکت و عمل کا چھوٹا سا شائبہ بھی موجود تھا۔ اقبال پر اعتراضات بھی اسی بنا پر سامنے آئے کہ کمال اتاترک پاشا جس نے مذہبِ اسلام میں خلافِ شریعت عناصر داخل کر کے قوم میں بے راہ روی پیدا کی۔ اسلامی عقائد و نظریات میں بگاڑ لایا اور اسلامی تہذیب کو بدل دینے کی مذموم حرکت کی۔ پھر بھی اقبال نے اس کی تعریف کی۔ تحریک کی حمایت میں بیان دیا۔ کارل مارکس، لینن اور مسولینی جسے اشخاص کے لیے تعریفی کلمات کیوں کہے جبکہ اقبالیاتی طبقے میں وہ ایک خالصتاً مذہبی شخصیت کا چہرہ رکھتے ہیں۔ یہ سارے اعتراضات لائقِ غور ہیں مگر ان سب کا یہی ایک جواب ہے کہ اس دورِ انحطاط میں اقبال نے جس شخصیت میں حرکت و عمل کا ذرا بھر اثر پایا، اس کی تعریف کر دی۔ لینن کی کوششوں کو سراہا۔ مسولینی نے اگرچہ مسلمانوں پر ظلم کیا مگر بحیثیتِ انسان وہ اپنی قوم کے لیے کچھ عمل کر رہا تھا۔ اس لیے اقبال نے اس کے نام پہ اپنی نظم کا عنوان رکھا۔ مسلمان سوئے تھے۔ اتاترک نے لبرل ہونے کے باوجود جہاد پر جب کمر باندھ لی تو علامہ اقبال نے اس کی تعریف کی۔ کارل مارکس نے یورپ کی طرف سے اقوامِ عالم پر مسلط کردہ سرمایہ داری کا جمود توڑا تو اقبال نے اس کو "کلیمِ بے تجلی و مسیحِ بے صلیب" کہہ کر پکارا۔

حرکت و عمل کو اقبال نے اپنے تصور کی بنیاد ہی نہیں بنایا بلکہ اپنے اشعار میں آنے والی بیشتر اصطلاحات سے بھی واضح کر دیا کہ ہر عمل یا سرگرمی جو قوائے عمل کو ضعیف کرتی ہے وہ انسان کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ اقبال نے فکر و عمل کے اوصاف، نظم مسولینی میں یوں بیان کیے ہیں:

نُدرتِ فکر و عمل کیا شے ہے، ذوقِ انقلاب
نُدرتِ فکر و عمل کیا شے ہے، ملت کا شباب
نُدرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
نُدرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب(۱۶)

جب یہی فکر و عمل انسان کے ہاتھ سے چلا جائے تو زندگی پھر موت کے مشابہ ہے۔ عمل اور کوشش و جستجو کے مادے کو مٹانے والی ہر شے سے اقبال نے بے زاری کا اظہار کیا ہے۔ وہ قوالی ہو یا علمِ کلام اقبال نے قوم کے حق میں سمِ قاتل سمجھا۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی جو کہ تصوف کے سلسلہ 'چشتیہ' سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی اس دور میں قوالی کی مذمت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ موصوف قوالی کو غیر اسلامی تصوف قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک قوالی انسان (مسلمان) میں حرکت و عمل کے جذبات کو مجروح کرتی ہے اور دنیا سے لاتعلقی اختیار کرنے کی تبلیغ ہے۔ موصوف کے بقول:

> "مسلمان قوالی زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ کاہل اور عیش پسند ہے۔ محنت مشقت سے جان چراتا ہے۔۔۔ قوالی میں اسے خود کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ رات کا کھانا کھا کر پانوں کی ڈبیا اور بٹوا لے کر محفل میں چلا گیا اور ساری رات زبان سے واہ واہ اور سبحان اللہ کرتا رہا اور صبح ہوتے گھر آ کر سو گیا"۔(۱۷)

قوالی پر بحث سے مقصود اس کا حلال یا حرام اور جائز یا ناجائز ثابت کرنا نہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ قوالی اقبالی فلسفہ میں کیا حقیقت رکھتی ہے۔ مسلمان اگر شرعی اصولوں پر پابندی اختیار کرے تو ہر قدم پر اسلام اسے آمادہ بر عمل دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ سست اور کاہل ہو گیا تو اسلامی روح اس کے دل سے محو ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں اسلامی غیرت کا فقدان پیدا ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو حرکت

وعمل سے دور کرے اقبال کے نزدیک وہ الحاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے قوتِ تخلیق (حرکت و عمل) کو کام میں نہ لانے والے کو کافر وزندیق (اصلاحی معنی نہ کہ اعتقادی) کہا:

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست[۱۸]

(ترجمہ: جس میں قوتِ تخلیق کا مادہ نہیں میرے نزدیک کافر وزندیق ہے) غیر اسلامی تصوف چونکہ حرکت و عمل سے دور کرتا ہے اس لیے اقبال کے ہاں اس کی مخالفت ہے۔ قوالی کا اثر انسان سے قوتِ تخلیق چھین لیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ قوالی اس دور میں خالص عشقِ حقیقی پر مبنی جذبات کی ترجمان نہیں رہی، بلکہ اس میں عشقِ مجازی کی ملاوٹ اور محفلِ سماع میں بیٹھے لوگوں کے جذبات کی عکاسی (طلبِ داد) کے ساتھ ساتھ جدید آلاتِ موسیقی کا شامل ہونا اس عمل کو مزید معیوب کر رہا ہے۔ لہٰذا عہدِ حاضرہ میں کہ جب اسلام ہر طرف زوال پذیر ہے اور مسلمان پر کفر و الحاد کے بادل چھائے ہوئے ہیں تو ایسا ہر عمل الحاد ہے جو مسلمان کو مزید تسہیل پسندی کی طرف مائل کرے۔

اسی طرح اقبال نے علم کلام کو دورِ حاضر کی افیون قرار دیا۔ علمِ کلام وہ ہتھیار ہے جو مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کے خلاف اپنے دفاع کے لیے استعمال کیا۔ یہ وہ دور تھا جب یہود و نصاریٰ جوق در جوق حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور اپنے قدیم عقائد کی بنا پر اسلام کے عقائد و نظریات کا موازنہ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ غیر مسلموں نے فلسفے کو موضوع بنا کر اسلامی عقائد و نظریات کو باطل قرار دینا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی مجبوری تھی کہ اسلام کا دفاع اسی نہج پہ آ کر کیا جائے۔ اسلامی عقائد کو عقلی بنیادوں پر لا کر ثابت کرنے سے علمِ کلام کی بنیاد پڑی۔ ایک وقت تک تو اس سے وہی کام لیا جاتا رہا جس غرض سے اس کی بنیاد پڑی تھی مگر ایک دور کے بعد اسی سے ہی ملتِ اسلامیہ میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ مسلمان غیر ضروری مباحث میں پڑ کر قوتِ حرکت و عمل سے بیگانہ ہو گئے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے عجمی تصوف نے مسلمانوں کو سہل پسندی کا خوگر بنایا، علمِ کلام

بھی مسلمانوں کے حق میں سستی اور کاہلی کا سامان بن گیا۔ وجودِ علمِ کلام کے پس پردہ کچھ اختلافات بھی تھے جنہیں مولانا شبلی نے اپنی کتاب 'علمِ کلام اور الکلام' میں بہ تفصیل بیان کیا۔

عہدِ حاضر میں علمِ کلام کی حیثیت نہ ہونے کے مترادف ہے۔ چونکہ مذہبی مناقشات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ حقائق کی دریافت سے زیادہ مدِ مقابل کو کم تر ثابت کرنے کے ڈھونگ تلاش کیے جاتے ہیں۔ مناظروں میں بیٹھنے والے مسئلے کا حل لینے نہیں آتے بلکہ وہ گرمجوش بحث سننے آتے ہیں تاکہ اپنی طرف کے عالم کی واہ واہ کر سکیں اور دوسرے کو دھتکار سکیں۔ اس وقت شریعت کے تمام امور واضح ہیں۔ جس غرض سے علمِ کلام کو معرضِ وجود میں لایا گیا وہ وجوہات اب باقی نہیں رہیں اس لیے علمِ کلام کے تحت چھیڑے جانے والے مباحث مثلاً ماہیتِ وجود، ماہیتِ علم، ماہیتِ روح، حدوث وقدیمِ کائنات، ذات وصفاتِ باری تعالیٰ، مسئلۂ جبر وقدر اور مسئلۂ خیر وشر وغیرہ کوئی خاص معنی نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان مباحث کا اب فائدہ کی بجائے الٹا نقصان یہ ہے کہ اس سے قوتِ عمل زائل ہو جاتی ہے اور انسان غیر ضروری مباحث میں اپنی صلاحیتیں گنوا دیتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے ابلیس کی زبانی کہا:

طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ "قوّالی" سے کچھ کم تر نہیں "علمِ کلام"![۱۹]

علامہ اقبال کے نزدیک ہر وہ شے جو انسان کو سستی اور کاہلی کی طرف مائل کرتی ہے الحاد ہے۔ اس سے انا یا شخصیت متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا قوالی یا علم کلام افیون سے بڑھ کر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اقبال نے اس سستی، کاہلی اور حرکت وعمل سے بے بہرہ قوم سے بے زاری کا اظہار ان الفاظ میں بھی کیا ہے:

کُہن ہنگامہ ہائے آرزو سرد
کہ ہے مردِ مسلماں کا لہُو سرد

بُتوں کو میری لادینی مبارک
کہ ہے آج آتشِ 'اَللہ ھُو' سرد(۲۰)

مردِ مسلماں کا لہو گرم تھا تو سومنات کے مندر بھی صدائے حق سے گونج اٹھے۔ اسی میں جب حرارت نہ رہی تو ہندوستان کی سرزمین نے مسلمانوں کو غلام پایا۔ اس وقت بت (اقوامِ باطل) مسلمانوں کی اس لادینی (فکر و عمل سے بے زاری) پہ خندہ زن ہیں۔

دینِ اسلام ابتدا تا انتہا حرکت و عمل کا پیغام ہے۔ اقبال کے ہاں مذہب اپنی اصلی شکل و صورت میں موجود ہو سکتا ہے جب مسلمان اس مذہب کے فطری اصولوں پر کاربند ہو گا۔ آج مسلمان حرکت و عمل سے بیگانہ، بنے بنائے نظامِ حیات پر عمل پیرا ہیں جو یورپ نے ان کے لیے تشکیل دیا ہے۔ اس راستے پر آنے والی ہر مادی و روحانی منزل مسلمان کے لیے ایک بت ہے اور اس کو قبول کر کے اس کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنا یہ پرستش ہے۔ آرزو یا خواہش (مبنی بر خیر) جو کہ عشق کے عناصر ترکیبی میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ عہدِ قدیم کے مسلمانوں کا شیوہ تھا۔ دورِ حاضر میں جب آرزو مٹ چکی ہے تو ذوقِ تحصیل و طلب کہاں سے آئے جو حقیقتِ زندگانی ہے۔ ملول ہو کر اقبال نے کہا کہ 'بتوں کو میری لادینی مبارک' اس لیے کہ جو حکمِ اذاں تفویض ہوا تھا، اس نائبِ خدا کے پاس اب وہ 'آتشِ اللہ ھو' ہے ہی نہیں جو اس جذبے کو گرم رکھتی اور خلیل اللہ علیہ السلام کی سنت کو زندہ کرتی ہے۔ "بت" یورپی قوانین اور ملحدانہ تہذیب کے لیے بطورِ علامت استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ جب ضابطہء حیات (اسلام) پر عمل پیرا ہونا مشکل ہوا (دینی و قلبی غلامی) تو مسلمان اس لادین نظامِ حیات کے پیروکار بن گئے۔ اقبال کے اس وعظ کا گویا اثر نہ ہوا:

وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جوَ
ناداں ! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسبابِ ہنر کے لیے لازم ہے تگ و دَو

وہ صاحبِ فن چاہے تو فن کی بَرکت سے
ٹپکے بدنِ مہر سے شبنم کی طرح ضَو![۲۱]

اس طرزِ فکر و عمل کے لیے 'آتشِ اللہ ھو' گرم رہنا ضروری ہے۔ جبکہ عہدِ جدید میں یہ عناصرِ کہن میں شامل ایک عنصر رہ گیا ہے۔

حرکت و عمل ہی عشق کی بنیاد ہے اور اسی سے انکشافِ ذات ممکن ہے جس کی آخری حد استحکامِ خودی سے انسان اپنے آپ کو لازوال کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں اس تحرک کی مثالیں کئی صورتوں میں موجود ہیں۔ جیسا کہ ارمغانِ حجاز اردو کی ایک رباعی میں "نہ دریا کا زیاں ہے نے گہر کا۔ دلِ دریا سے گوہر کی جدائی"[۲۲] جیسے افکار کائنات کی ہر شے میں تحرک و جستجو کا راز فاش کرتے ہیں۔ ایک موتی دریا کی لہروں میں کوشاں و سرگرداں رہتا ہے تو اس جفاکشی کے بدلے اسے ابدی تابناکی حاصل ہوتی ہے۔ یہی مثال ہے انسان کے لیے کہ جب بحرِ ہستی میں رہتے ہوئے اس کی ٹھوکریں سہتا ہے اور اپنی بقا کی ترکیبیں نکالتا ہے، تسخیرِ فطرت کے تمام ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، تو یہی جستجو اس کی خودی کو مکمل کرتی ہے۔ اقبال کا مردِ درویش اس لیے خلوت پسند ہوتا ہے کہ اپنی ذات پر غور کر سکے اور پوشیدہ صلاحیتوں کی معرفت حاصل کر سکے۔ اسے بیاباں کی خلوت اس لیے پسند ہے کہ ہوائے بیاباں سے جواں مرد کی ضرب کاری ہوتی ہے۔ حرکت و عمل کا یہ فلسفہ اقبال کے تصورِ خودی میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> "خودی کا لفظ اقبال کے پیغام یا فلسفۂ حیات میں تکبر و غرور یا اردو فارسی کے مروجہ معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ خودی اقبال کے نزدیک نام ہے احساسِ غیرت مندی کا، جذبۂ خودداری کا، اپنی ذات و صفات کے پاس و احساس کا، اپنی انا کو جراحت و شکست سے محفوظ رکھنے کا، حرکت و توانائی کو زندگی کی

ضامن سمجھنے کا، مظاہراتِ فطرت سے بر سرِ پیکار رہنے کا اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا"۔[۲۳]

خودی کی جو وضاحت مقتبس متن میں آئی ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مذکورہ رباعی کا مطالعہ کیا جائے تو حرکت و عمل اور کوشش و جستجو کی فکر چاروں مصرعوں میں واضح ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ "اصل زندگی ہے خود نمائی"۔ اس میں فکر و عمل، کوشش و جستجو، عشق، خودی اور دیگر تصورات کا حوالہ موجود ہے۔ اس تصور میں شدت دیکھیے کہ اقبال مفت میں ملے ہر مقام اور ہر فائدے کو گداگری تصور کرتے ہیں جس میں انسان کی ذاتی کوشش و جستجو شامل نہ ہو:

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنّت تری پنہاں ہے ترے خُونِ جگر میں[۲۴]

یہ وہ پیغام ہے جو زمین آدم کو دیتی ہے اور اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے:

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی[۲۵]

جب تک اپنے خونِ جگر سے دامِ فردوس کی ادائیگی کے قابل نہیں ہوا جاتا تب تک ہر قسم کی جنت (آرام و سکون) مردِ خوددار پر حرام ہے۔ جھپٹنے، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے میں مقامِ خودی کو فاش کرنے کا راز موجود ہے۔ اگر انسان اس صفت سے عاری ہو گیا تو موت و حیات اس کے لیے یکساں تجربے ہیں۔

دریں اثنا اقبال کے کلام میں لفظ "آرزو" اس قدر معنی کی گہرائی رکھتا ہے کہ اس پر الگ سے بحث ضروری ہو جاتی ہے۔ کلامِ اقبال میں لفظ آرزو 'حرکت' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ازروئے اقبال یہی زندگی کا راز ہے۔ آرزو وہ شر رہے جو اندر سے انسان کو متحرک رکھتا ہے۔ آدمی ہر وقت کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی تڑپ میں رہتا ہے۔ یہی سرِّ حیات ہے۔ خواہش انسان کو زندگی

سے بے زار نہیں ہونے دیتی۔ اقبال نے بیشتر مقامات پر حرکت و عمل پیدا کرنے کی غرض سے 'آرزو' کو موضوع بنایا ہے:

تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دُعا ہے تری آرزو بدل جائے! (۲۶)

اقبال آرزو بدلنے کی دعا اپنے اس تصور کے تحت کر رہے ہیں کہ عہدِ حاضر کا مسلمان اطمینان اور سکون پانے کی آرزو رکھتا ہے۔ مگر اس کی زندگی کا راز تڑپ میں ہے۔ اگر شرارِ جستجو اس کے دل میں بجھ گیا تو غلامی روزِ ابد تک اس کا مقدر ہے۔ اقبال کے تصورِ حرکت و عمل (حیات) میں آرزو یا خواہش کو خاص عمل دخل ہے:

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پِسَر!
وہ مزا شاید کبوتر کے لہُو میں بھی نہیں (۲۷)

یہاں بھی 'جھپٹنے' کے لفظ میں حرکت کا احساس نمایاں ہے۔ آرزو ہی وہ بنیاد ہے جو انسان کے قوائے عمل کو آمادہ بر عمل کرتی ہے۔ یہ آرزو فقط انسان میں ہی نہیں ہے بلکہ کائنات کی ہر شے اپنے وجود کی نمائش کی آرزو مند ہے۔ قطرۂ آب کی چمک، پانی کو سطح کی غیر ہمواری پہ شور و غل مچانا، موتی کا موجوں کی کشمکش میں اپنے آپ کو اذیت دینا، پھول کا غنچے سے باہر آ کر اپنا وجود ظاہر کرنا اور اسی خوشی میں خزاں کی سولی پہ چڑھنا یہ تمام مثالیں "آرزو" ہی کی ہیں۔

اقبال نے عالمِ انسانیت کے لیے بالعموم اور عالمِ اسلام کے لیے بالخصوص یہ تصور پیش کیا ہے۔ اقبال کی شاعری کا دور عالمِ اسلام کا دورِ انحطاط کہا جا سکتا ہے جہاں چاروں اطراف سے مسلمانوں پہ ظلم کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ اس صورت میں مسلمانوں کو جگانے کے لیے کون کون سی شخصیات کو موضوع بنایا یا کن کن تحاریک کے نمونے سامنے رکھے، کلام میں بالکل عیاں ہیں۔ کبھی ماضی میں مسلمانوں کے کارناموں کی تعریف کی تو کبھی موجودہ مسلمانوں کے طرزِ عمل

میں اظہارِ افسوس کیا۔ جس طرح گھر کے بڑے ہمیشہ اپنے ماتحتوں کو احساسِ زیاں دلاتے رہتے ہیں اسی طرح اقبال نے اس قوم کو احساسِ زیاں دلایا۔ انھوں نے دورِ حاضر کے امام کا وصف بھی یہی بتایا کہ امام وہ ہے جو احساسِ زیاں دے کر مسلمان کا لہو گرم کر دے اور پھر فقر کی سان چڑھا کر مسلمان کو تلوار بنا دے۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہُو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے[۲۸]

یہ وہ تلوار ہے جو سستی اور کاہلی کے ہر وجود کو کاٹ کر رکھ دے۔ اقبالؒ نے اپنے عہد کے نوجوان سے ملنے والی دل آزاری کو جہاں افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں کی مد میں بیان کیا وہیں افکار و خیالات میں بے مائیگی کو بھی وجہِ تنزل قرار دیا:

اب تک ہے رواں گرچہ لہُو تیری رگوں میں
نے گرمیِ افکار، نہ اندیشۂ بے باک[۲۹]

فلسفۂ اقبال میں زندگی لہو کی گردش اور سانسوں کے دخول و اخراج کا نام نہیں بلکہ زندگی کوشش و جستجو اور تحصیل و طلب کا نام ہے۔ تحصیل و طلب ہی حسنِ حیات ہے اور ارتقائے حیات کا راز اسی میں مضمر ہے۔ تحصیل و طلب کا یہ عنصر مثبت ہونے سے مشروط ہے۔[۳۰] شعر میں اسی وصف کو گرمئ افکار کہا ہے۔ گرمئ افکار سے ہی انقلاب حیات ممکن ہے۔

اگر اقبال کے اس فلسفۂ حرکت و عمل کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایٹم کے اندر موجود عناصر کا متحرک رہنا اور خلیے کے عناصرِ ترکیبی کا ہر آن اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہنا اس فطری امر کی شہادت ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو اپنا جمود توڑنا ہے اور سہل پسندی کے حصار سے

نکل کر میدانِ عمل میں آنا ہے۔ کیونکہ "جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد، ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ" [۳۱] اس وقت یورپ میدانِ ایجاد میں آگے ہے اس لیے دنیا، علم و فن کے حصول میں اسی کا طواف کرتی ہے۔ اگر مسلمان تحقیق کے میدان میں آگے آجائیں تو حرکت و عمل کا ثبوت دیتے ہوئے دوبارہ سے علم و فن کی دنیا کے امام بن سکتے ہیں۔ اس کلیے پہ عملی اقدام کا لائحۂ عمل اقبال نے اپنے شاعری میں مکمل حد تک بیان کیا ہے۔ "بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست، اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است" (اپنے آپ کو محمدِ مصطفیٰ ﷺ تک پہنچا دو وہی سارے کا سارا دین ہیں۔ اگر وہاں تک نہ پہنچ پاؤ تو سا سے کی ساری بولہبی ہے) جیسا شعر اس حوالے سے جہانِ معنی کا آئینہ دار ہے کہ دنیا میں حرکت و عمل اور حصولِ عزت و جاہ کے لیے مصطفائی نظام پہلے اپنی ذات اور پھر معاشرے میں لانا لازم ہے۔ اگر ہمارا کوئی عمل اس طریق کے خلاف ہوا تو سارے اعمال اور علم و فنون جہالت کے زمرے میں آئیں گے۔ نبیِ کریم ﷺ نے اسلام میں رہبانیت (ابو داؤد: ۱۳۶۹) کو ممنوع قرار دے کر مومنین کو سستی اور کاہلی سے دور رکھا اور زمگاہِ حیات میں ہمیشہ بر سرِ پیکار رہنے کی تعلیم دی جسے اقبال نے "دیں ہمہ اوست" سے ظاہر کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر سید عابد حسین: اقبال کا تصورِ خودی (لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، س ن)، ص ۲

۲۔ علامہ اقبال: بالِ جبریل (لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، اشاعت دوم، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۳۰

۳۔ یوسف حسین خان: روحِ اقبال (نئی دہلی: غالب اکیڈمی، ۱۹۷۴ء)، ص ۴۴۰

۴۔ علامہ اقبال: بانگِ درا (لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، اشاعت دوم، ۱۹۹۴ء)، ص ۷۱-۷۲

۵۔ علامہ اقبال: بالِ جبریل (لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، اشاعت دوم، ۱۹۹۴ء)، ص ۸۱

۶۔ علامہ اقبال: "دیباچہ اسرارِ خودی"، ترجمہ چھوٹے لال، مشمولہ شرح اسرارِ خودی از پروفیسر یوسف سلیم چشتی (لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، س ن)، ص ۱۹

۷۔ شمیم حنفی: اقبال کا حرفِ تمنا (نئی دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند، ۱۹۹۶ء)، ص ۷۷

۸۔ ایضاً، ص ۷۸

۹۔ ڈاکٹر شاہد مختار: افلاطون۔ حیات و تعلیمات، فکر و فلسفہ (لاہور: شاہد پبلشرز، س ن)، ص ۲۷

۱۰۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی: شرح اسرارِ خودی، ص ۱۶

۱۱۔ علامہ اقبال: بانگِ درا، ص ۲۸۳

۱۲۔ علامہ اقبال: ضربِ کلیم (لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، اشاعت دوم، ۱۹۹۴ء)، ص ۵۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۷۳

۱۴۔ ڈاکٹر سید عابد حسین: اقبال کا تصورِ خودی، ص ۹

۱۵۔ پروفیسر حمید اللہ ہاشمی: "دیباچہ اسرارِ خودی"، مشمولہ شرح کلیاتِ اقبال (فارسی) از پروفیسر حمید اللہ ہاشمی (لاہور: مکتبۂ دانیال، س ن)، ص ۱۴

۱۶۔ علامہ اقبال: بالِ جبریل، ص ۱۵۶-۵۷

۱۷۔ یوسف سلیم چشتی: ارمغانِ حجاز باشرح، ص ۱۶

۱۸۔ علامہ اقبال: جاوید نامہ (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت دوم، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۸۸

۱۹۔ علامہ اقبال: ارمغانِ حجاز (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت دوم، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۰

۲۱۔ علامہ اقبال: کلیاتِ اقبال (لاہور: سعد پبلی کیشنز، س ن)، ص ۶۵۰

۲۲۔ علامہ اقبال: ارمغانِ حجاز، ص ۴۲

۲۳۔ فرمان فتح پوری: اقبال سب کے لیے (کراچی: اردو اکادمی سندھ، طبع اول ۱۹۷۶ء)، ص ۶۹

۲۴۔ علامہ اقبال: کلیاتِ اقبال، ص ۳۷۴

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۱۰

۲۶۔ علامہ اقبال: کلیاتِ اقبال، ص ۶۴۸

۲۷۔ ایضاً، ص ۴۶۲

۲۸۔ علامہ اقبال: ضربِ کلیم، ص ۶۲-۶۳

۲۹۔ علامہ اقبال: ارمغانِ حجاز، ص ۳۵

۳۰۔ سید نذیر زیدی (مترجم): مقدمہ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (نئی دہلی: اسلامک بک سنٹر، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۹

۳۱۔ علامہ اقبال: ضربِ کلیم، ص ۱۷۹

ماخذ

- القرآن الکریم
- صحیح البخاری
- صحیح المسلم
- سنن ترمذی
- سنن ابنِ ماجہ
- سنن ابو داؤد
- سنن نسائی
- علامہ اقبال: کلیاتِ اقبال (اردو)۔ لاہور: سعد پبلی کیشنز، س ن
- علامہ اقبال: کلیاتِ اقبال (اردو)۔ لاہور: نقوش پریس، اشاعت چہارم، ۱۹۹۴ء
- پروفیسر حمید اللہ ہاشمی: شرح کلیاتِ اقبال (فارسی) لاہور: مکتبۂ دانیال، س ن
- پروفیسر یوسف سلیم چشتی: شرح اسرارِ خودی۔ لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، س ن
- ڈاکٹر سید عابد حسین: اقبال کا تصورِ خودی۔ لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، س ن
- ڈاکٹر شاہد مختار: افلاطون۔ حیات و تعلیمات، فکر و فلسفہ۔ لاہور: شاہد پبلشرز، س ن
- ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان: اقبال اور قرآن۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع چہارم، ۱۹۹۸ء
- سید نذیر زیدی (مترجم): مقدمہ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ۔ نئی دہلی: اسلامک بک سنٹر، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۹
- شمیم حنفی: اقبال کا حرفِ تمنا۔ نئی دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند، ۱۹۹۶ء
- عبد السلام ندوی: اقبالِ کامل۔ اعظم گڑھ: دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۹ء
- فرمان فتح پوری: اقبال سب کے لیے۔ کراچی: اردو اکادمی سندھ، طبع اول ۱۹۷۶ء
- فقیر سید وحید الدین: روز گارِ فقیر، لاہور: لائن آرٹ پریس لمیٹڈ، بار چہارم، ۱۹۶۴ء
- یوسف حسین خان: روحِ اقبال۔ نئی دہلی: غالب اکیڈمی، ۱۹۷۴ء